خوبصورتی سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب!
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

یہ جو ہماری زندگی ہے یہ حباب کی مانند ہے' بڑی عارضی' بڑی فانی' پانی کا بلبلہ' جو اَب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بلبلے کی اس سے زیادہ اور کیا حیثیت ہے۔ اس حیاتِ دُنیوی کی پائیداری پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا کہ یہ کب تک رہے گی۔ لیکن جتنی دیر بھی یہ بلبلہ قائم رہے اس کی بھی ایک غرض و غایت ہے۔ وہ بھی عبث نہیں ہے۔ ذرا اس کائنات کی وسعتوں کا تصور کیجئے' جس کو علامہ مرحوم نے اس شعر میں قلزم سے تعبیر کیا ہے۔ پس یہ زندگی ایک آزمائش اور امتحان سے زیادہ کوئی حیثیت اور وقعت نہیں رکھتی ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

حیاتِ ابراہیمیؑ : امتحان و آزمائش کی مثالِ کامل

اس امتحان کی جو کامل و مکمل مثال قرآن مجید پیش کرتا ہے وہ حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) کی زندگی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۴ کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے : ﴿ وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ﴾ "اور یاد کرو کہ جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے بڑی بڑی باتوں میں تو وہ ان سب میں پورا اتر گیا" —— یہاں لفظ ابتلاء آگیا۔ اس کے معنی ہیں کسی کو آزمانا' امتحان و آزمائش میں ڈالنا —— یہاں لفظ بِكَلِمٰتٍ میں تنوین تنکیر کے لئے آئی ہے' یعنی اس نے اس کو نکرہ بنا دیا ہے' اور تنکیر عربی زبان میں تفخیم کے لئے یعنی کسی چیز کی عظمت و شان کو بیان کرنے کے لئے آتی ہے۔ چنانچہ بِكَلِمٰتٍ میں بڑے بڑے اور کٹھن امتحانات کا مفہوم شامل ہو گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کے رب نے بڑے سخت اور مشکل امتحانات لئے' لیکن اس اللہ کے بندے نے سب کو پورا کر دکھایا۔ فَاَتَمَّهُنَّ۔

اس کی قوتِ ارادی میں کہیں ضعف و تأمل پیدا نہیں ہوا' اس کی عزیمت میں کمزوری اور تذبذب کے کہیں آثار ہویدا نہیں ہوئے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ان امتحانات کو پاس کر گئے تو ان کو یہ بشارت دی گئی : ﴿ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ "(اللہ تعالیٰ نے) کہا (اے ابراہیم علیہ السلام) یقیناً میں تجھے پوری نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برینائے طبعِ بشری فوراً سوال کیا : ﴿ قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ﴾ عرض کیا: اے اللہ! یہ وعدہ صرف مجھ ہی سے ہے یا میری نسل سے بھی ہے؟ ﴿ قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴾ "فرمایا : میرا یہ عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہوگا"۔ تمہاری نسل میں سے جو ظالم ہوں گے وہ اس وعدے کے مستحق نہیں ہوں گے —— "ظلم" کے متعلق ہمارے اکثر دروس میں ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن کریم میں اکثر و بیشتر "ظلم" کے لفظ سے شرک مراد ہوتا ہے —— تمہارا اصل کمال یہ ہے کہ تم نے توحید کی ترازو میں پورا اتر کر دکھایا۔ اس کی وجہ سے تم "امام النّاس" کے مقام پر فائز کئے جا رہے ہو۔ اب تمہاری نسل میں سے جو لوگ مشرک ہو جائیں گے تو وہ میرے اس عہد کے حق دار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس مفہوم کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے بڑے سادہ الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو؟

معاملہ کسی اصول کے تحت ہوگا۔ محض نسل کے اعتبار سے ہو تو یہ انصاف اور عدل و قسط کے منافی ہوگا۔

فکر و نظر کا امتحان :

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا امتحان تو ان کے فکر و نظر اور عقل و شعور کا تھا۔ اس امتحان میں انہوں نے کتنی عظیم الشان کامیابی حاصل کی' اس کا ذکر سورۃ الانعام میں ہے۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جس

میں ہر نوع کے شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ توحید کی کوئی کرن کہیں موجود تھی ہی نہیں۔ شرک کی جتنی اقسام ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب موجود تھیں۔ سیاسی شرک' یعنی غیر اللہ کی حاکمیت کا شرک وہاں موجود تھا' بادشاہِ وقت نمرود خدائی حقوق کا دعوے دار بن کر تخت حکومت پر متمکن تھا۔ مذہبی شرک کی حیثیت سے ستارہ پرستی وہاں مروج تھی۔ سورج' چاند' ثریّا اور دوسرے ستارے وہاں پوجے جا رہے تھے۔ اصنام پرستی وہاں موجود تھی' بُت کدے وہاں موجود تھے۔ اسی طرح پروہتوں اور پنڈتوں کا نظام وہاں موجود تھا۔ یہ تفصیل اگرچہ قرآن حکیم میں تو بیان نہیں ہوئی لیکن عام روایت یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود ایک پروہت کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ آزر صنم گر بھی تھا اور ان کے ہاں جو مذہبی monarchy رائج تھی اس میں اس کے پاس ایک اہم منصب تھا۔ تو تمام انواع و اقسامِ شرک موجود' شرک کا گھٹا ٹوپ اندھیرا' اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فطرت و عقل سلیم کی رہنمائی میں نظری' فکری اور عقلی سفر کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر یہ نعرۂ توحید ان کی زبان پر آتا ہے:

﴿ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴾ (الانعام : ۷۹) یہ نعرۂ مؤمنانہ اس ماحول میں دراصل نعرۂ بغاوت ہے کہ: "میں تمہارے تمام معبودوں کا انکار کرتا ہوں اور میں نے یک سُو ہو کر اپنا رُخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے"۔ پھر انہوں نے بڑے مؤثر انداز میں اپنے والد اور اپنی قوم کی گمراہیوں پر ٹوکا' جیسا کہ سورۃ الانعام میں مذکور ہے:

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِھَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ ﴾ (الانعام : ۷۴)

"ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا: کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں"۔

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے :

﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴾

(الانبیاء : ۵۲)

"یاد کرو وہ موقع جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟"

غرض مختلف پیرایۂ بیان اور اسالیب سے آپؑ بار بار اپنے والد اور قوم سے کہتے ہیں کہ کیا ہیں یہ مورتیاں جو تم نے گھڑلی ہیں' جن کا تم دھیان اور گمان کر کے بیٹھے ہو' جن کی تم ڈنڈوت کرتے ہو۔

﴿ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۹۵)

"(ابراہیمؑ نے) کہا : کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟"

پھر آخری چوٹ لگاتے ہیں یہ فرما کر کہ :

﴿ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

(الانبیاء : ٦٧)

"(تمہیں کیا ہو گیا ہے؟) تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل عاری ہو چکے ہو؟"

پھر پوری جرأت مؤمنانہ کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں :

﴿ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ ﴾

(الانبیاء : ۵۷)

"اور خدا کی قسم! میں تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے ان بُتوں کے ساتھ کوئی معاملہ کر کے رہوں گا (ان کی خبر لے کے رہوں گا)۔"

یہ جو نعرہ ہے' یہ جو بیداری ہے' یہ جو عزائم ہیں' ایک ایسے ماحول میں جہاں توحید باری تعالیٰ سے کوئی ادنیٰ سی واقفیت بھی موجود نہیں ہے' تو یہ ان کی فطرت و عقل سلیم کی آزمائش کا پہلا مرحلہ ہے' پہلا امتحان ہے' جس میں وہ شاندار طریقے پر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

قوتِ ارادی کی آزمائش :

اب دوسرا امتحان عمل کا شروع ہوا۔ قوتِ ارادی کی آزمائش کی ابتداء ہوئی۔ سیرت و کردار کی پختگی کو کسوٹی پر پرکھنے کے عمل کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلی کشمکش تو اپنے والد سے ہوتی ہے۔ سورۂ مریم میں اس کا ذکر ہے۔ کیسی لجاجت کے ساتھ اپنے والد کو توحید کی دعوت پیش کرتے ہیں کہ ابّا جان! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟

﴿ يٰاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۖ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴾

"ابّا جان! شیطان کی بندگی (اور پرستش) نہ کیجئے! بلاشبہ شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔"

﴿ يٰاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّاO ﴾

"ابّا جان! مجھے اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ آپ کو رحمٰن کی طرف سے عذاب آ دبوچے (اور آپ کو اللہ کی سزا پکڑ لے) اور آپ شیطان کے ساتھیوں میں سے ہو جائیں۔"

اس سے پہلے بڑی لجاجت سے کہہ چکے ہیں کہ :

﴿ يٰاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّاO ﴾

"ابّا جان! میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' پس آپ میری پیروی کیجئے۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے!"

لیکن اس تمام لجاجت اور پورے ادب و احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش کی ہوئی دعوت کا جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ :

﴿ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّاO ﴾

"اس نے کہا: اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے روگردانی کر رہے ہو (ہماری قومی و نسلی روایات کو اپنے پاؤں تلے روند دینا چاہتے ہو؟) اگر تم باز

نہیں آؤ گے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ (یہ تو خیر بعد کی بات ہے) اس وقت تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ (اور فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ)"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب میں کہتے ہیں :

﴿ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ ﴾

"کہا : آپ پر سلامتی ہو' میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو معاف کر دے۔ یقیناً میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔"

وہ اللہ کا بندہ گھر سے نکل رہا ہے باپ کو سلام کر کے۔ اس جھڑکی' سنگسار کرنے کی دھمکی اور گھر سے ہمیشہ کے لئے نکالے جانے پر بھی اللہ کا یہ بندہ کہتا ہے کہ "سَلَامٌ عَلَيْكَ" اور اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں' جو مجھ پر بڑا مہربان ہے' آپ کے لئے استغفار کروں گا۔ ارادے' عزم اور سیرت و کردار کی پختگی کا یہ پہلا امتحان ہے جس میں حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) پورے اترتے ہیں۔

بُت شکنی کا اقدام :

اب آیا معاملہ عوام کا —— وہ عوام جو فی زمانہ خدائی کے مدّعی ہیں۔ کبھی ایک فرد حاکمیتِ مُطلقہ کا مدعی ہوا کرتا تھا' اب عوام اس کے مدعی ہیں —— بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا —— اب آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے جذبات و احساسات اور ان کے عقائد کا اندازہ کیجئے —— کسی کو ہندو قوم کا ذرا سا بھی تجربہ ہو تو وہ جانتا ہو گا کہ بُتوں کے بارے میں اور ان کے جو بُت کدے اور اصنام خانے ہیں ان کے بارے میں ان کے جذبات و احساسات کیا ہیں؟ ایسے شخص کو اندازہ ہو گا کہ کتنی جراَتِ مؤمنانہ تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور انہوں نے کس قدر عظیم کام کیا کہ اُن کے سب سے بڑے صنم خانے میں جا کر اُن کے تمام بُتوں کو' سب سے بڑے بُت کو چھوڑ کر' توڑ پھوڑ ڈالا اور بایں طور ان کے باطل عقائد پر ضرب کاری لگا دی۔ یہ واقعہ سورۃ الانبیاء میں قدرے تفصیل سے آیا ہے۔ انہوں نے قسم کھائی

تھی کہ میں ان بُتوں کی خبرلوں گا۔ چنانچہ ایک موقع پر جبکہ شہر کے تمام لوگ کسی تہوار کے سلسلے میں پوجاپاٹ اور میلہ میں شرکت کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، جیسے ہندوؤں میں بھی بعض تہوار شہر سے باہر منائے جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سب سے بڑے بُت کدے میں جاکر ان کے بڑے بُت کو چھوڑ کر باقی سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تیشہ بڑے بُت کے گلے میں لٹکا دیا۔ یہ اس لئے کہ شاید ان کی قوم حقیقتِ نفس الامری کی طرف رجوع کر سکے۔ قرآن مجید اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ○ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ○ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ○ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ يَنْطِقُوْنَ ○ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ○ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ ﴾ (الانبیاء : ۵۸ تا ٦۷)

"چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے کو چھوڑ دیا، تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (انہوں نے آکر بُتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے: ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی ظالم تھا وہ۔ (بعض لوگ) بولے: ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، جس کا نام ابراہیم ہے۔ انہوں نے کہا: تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں (کہ اس کی خبر کیسے لی جاتی ہے)۔ (ابراہیم علیہ السلام کے آنے پر) انہوں نے پوچھا: کیوں ابراہیم! تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ اس نے جواب دیا: بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے، ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے

ہیں۔ یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: واقعی تم خود ہی ظالم ہو۔ مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے: تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچانے پر قادر ہیں اور نہ نقصان۔ تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟"

ان آیات میں ﴿ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ والی آیت خاص طور پر قابل غور ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلوبِ گفتگو، اندازِ تبلیغ اور استدلال و حجت نے ان مشرکوں کو نہ صرف مبہوت اور لاجواب کر دیا، بلکہ اس کا اس حد تک اثر ہوا کہ لوگوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا اور محسوس کر لیا کہ بات ابراہیم ہی کی صحیح ہے، اصل میں ہم ہی غلطی پر ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بطورِ حجت اُن سے یہ کہا: ﴿ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾ اس بڑے بُت نے توڑ پھوڑ کا یہ کام کیا ہو گا، چونکہ یہ موقع واردات پر موجود بھی ہے اور آلۂ واردات بھی اس کے پاس ہی سے برآمد ہوا ہے۔ گویا عام واقعاتی شہادتیں (Circumstancial Evidences) تو اس بڑے بُت کے خلاف جا رہی ہیں۔ پھر یہ تمہارے معبودان جو ٹوٹے پھوٹے اور بکھرے پڑے ہیں، تو اگر یہ بول سکتے ہوں تو انہی سے پوچھ لو کہ ان کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ اس حجت سے انہوں نے اپنے دلوں میں محسوس تو کر لیا کہ مت تو ہماری ہی ماری گئی ہے، یہ بُت بول کب سکتے ہیں! اور یہ بات ان کی زبان پر بھی آ گئی کہ اے ابراہیم! تُو تو جانتا ہی ہے کہ یہ بول نہیں سکتے۔ لیکن دل میں کسی حقیقت کا منکشف ہو جانا اور بات ہے اور اس حقیقت کو دل و جان سے قبول کر لینا اور اس کا اقرار کر لینا بالکل دوسری بات ہے ؎

زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!

دنیا میں ہر دور میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں رہی' بلکہ معتدبہ تعداد رہی ہے جن پر حقیقتِ نفس الامری منکشف تو ہو جاتی ہے لیکن ان میں اس کو قبول کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہوتا —— مقابلتاً ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جن کے اندر کی بصیرت اور اندر کا انسان بالکل مر چکا ہوتا ہے اور ان کی عقل پر پتھر پڑ چکے ہوتے ہیں —— اگر انسان کے باطن میں حیاتِ معنوی کسی درجے میں باقی ہو تو حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس انکشافِ حقیقت کا اعتراف کر لینا اور اس کو تسلیم و قبول کر لینا آسان کام نہیں ہے —— مصلحتیں ہیں' چودھراہٹیں ہیں' مفادات ہیں' جو دامن کو پکڑ لیتے ہیں۔ اب وہاں جو پُجاری' پنڈت اور پروہت ہوں گے ان کے مفادات اور ان کے vested interests آخر کیسے پوجاپاٹ اور اصنام پرستی کے نظام کے خاتمے کو گوارا کر لیتے؟ اصنام پرستی کے نظام میں جو نذرانے بُتوں پر چڑھائے جاتے ہیں غور کیجئے کہ وہ نذرانے اور وہ حلوے مانڈے آخر کہاں جاتے ہیں؟ وہ ان ہی پروہتوں اور پنڈتوں کے یہاں ہی تو جاتے ہیں —— پھر بادشاہی کا جو نظام چل رہا ہوتا ہے وہ بھی ان نذرانوں اور چڑھاووں سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت کی اس عملی تدبیر سے ان پر حقیقت تو منکشف ہو گئی لیکن وہ اس کو قبول نہ کر سکے —— اس امتحان میں بھی حضرت ابراہیم (علیٰ نبینا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام) سرخرو ہوتے ہیں۔ ورنہ خود سوچئے کہ اس situation میں ایک mob کا مواجہہ کرنا کیا آسان کام تھا؟

حاکمِ وقت سے مباحثہ :

عوام کے ساتھ اس مقابلے میں کامیاب ہو جانے کے بعد اب حکومت و اقتدارِ وقت سے مقابلہ کی نوبت آتی ہے اور اس سے محاجّہ' مباحثہ اور تصادم ہوتا ہے —— عوام کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا ذکر سورۃ الصافات میں بھی ہے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۃ الانبیاء میں ہے —— البتہ بادشاہِ وقت کے دربار میں جو پیشی ہوئی' اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں ہے۔ فرمایا :

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ ﴾
(البقرۃ : ۲۵۸)

''کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا؟ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور اس بناء پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا : زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔''

ایک عظیم شہنشاہ کے دربار میں پیشی ہے جو خدائی کا بھی مدّعی ہے۔ ذرا چشمِ تصوّر سے دیکھئے کہ اس کے دربار کے کیا ٹھاٹ باٹ ہوں گے! کتنا بارعب ماحول ہو گا! عمائدینِ سلطنت ہاتھ باندھے صف در صف کھڑے ہوں گے۔ سب کی گردنیں خم اور نگاہیں نیچی ہوں گی۔ کسی کی مجال نہیں ہو گی کہ شہنشاہِ وقت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے' لیکن اس بارعب ماحول میں وہ نوجوان پوری طمانیتِ خاطر کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں' کوئی اندیشہ نہیں' کسی قسم کا کوئی ہراس نہیں اور وہ پوری دلیری کے ساتھ اس خدائی کے دعوے دار شہنشاہ سے محاجّہ کرتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ ﴿ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ﴾ اس بیوقوف نے بحث میں الجھنے کی خاطر کہا کہ ﴿ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ﴾ ''میں بھی جِلاتا اور مارتا ہوں'' یہ اختیار تو میرے ہاتھ میں بھی ہے —— روایات میں آتا ہے کہ یہ کہنے کے بعد اس نے جیل سے دو قیدیوں کو بلایا' ایک کی گردن اڑا دی اور ایک کو آزاد کر دیا کہ جاؤ مزے کرو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تم نے دیکھا میرا اختیار! میں نے ایک کو مروا دیا اور ایک کو زندہ رکھا —— اس کی اس کج بحثی کا رویہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً آخری حجت پیش کر دی : ﴿ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ ''ابراہیم نے کہا کہ (میرا) اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے (اگر تجھ میں خدائی کا کچھ اختیار ہے تو) تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا!''

—— اس حجت قاطعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ : ﴿ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ﴾ "(یہ سن کر) وہ منکرِ حق ششدر ہو کر رہ گیا" —— اس امتحان میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو گئے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق!

اب آیا ایک اور بڑا امتحان۔ یہ امتحان دنیا میں اکثر لوگوں کو پیش آتا رہتا ہے۔ نمرود نے جب اس محاجّہ میں منہ کی کھائی تو اس نے طیش میں آ کر کہا کہ اب آخری فیصلہ کر لو۔ زندگی عزیز ہے تو اس مسلک کو اور اس دعوتِ توحید کو چھوڑنا ہو گا اور اگر اسی مقصد پر ڈٹے رہو گے تو موت تمہارا مقدر ہو گی۔ ہمارے محاورے میں یوں کہہ لیجئے کہ تمہیں پھانسی کے پھندے کو چُوم کر گلے میں ڈالنا ہو گا۔ یا جیسے سقراط سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا ہو گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فیصلہ اس کے سوا کیا ہو تا کہ اپنے موقف سے سرمو ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو تا' ان کا موقف تو یہی رہا کہ :

﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَاشَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾

(الانعام : ۱۶۳)

زندگی جاتی ہے تو جائے توحید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا —— شہنشاہِ وقت کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزیمت کو دیکھ کر طیش اور غضب سے کیا حال ہوا ہو گا' اس کا آپ حضرات بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس نے محاجّہ میں اپنی شکست کی شرمساری سے بچنے کے لئے اور اپنے عمائدین اور عوام کے مطالبے پر حکم دیا کہ ابراہیم کو آگ کے الاؤ میں جلا ڈالو اور اس طور پر اپنے معبودوں کی حمایت کرو اگر تم کو کچھ کرنا ہی ہے ﴿ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ○ ﴾ (الانبیاء : ۶۸)

چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ دھکایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں کود پڑنے کے لئے کہا گیا اور وہ کود گئے۔ اس کو بھی علامہ اقبال مرحوم نے

بڑی خوبصورتی سے شعر کا جامہ پہنایا ہے' وہ کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

دیکھئے' یہاں بڑی پیاری بات آ گئی ہے۔ عقل کا امتحان توحید باری تعالیٰ کی معرفت کے مرحلے میں تھا۔ اس موقع پر عقل کا امتحان نہ تھا — عقل تو ایسے مواقع پر یہ سمجھائے گی کہ جان بچاؤ۔ عقل تو ایسے حالات میں انسان کو مصلحتوں کا راستہ دکھاتی ہے۔ عربی زبان میں "عقل" کہتے ہیں باندھنے کو۔ عربوں کے سر پر رومال جس چیز سے بندھا ہوتا ہے اسے "عِقال" کہا جاتا ہے اور یہ اسی لفظ "عقل" سے بنا ہے۔ اصل میں یہ ماضی کے ایک دستور کی یادگار ہے۔ عرب کے بدّو کی کُل کائنات اس کا اونٹ ہوا کرتا تھا۔ اسی پر اس نے سفر کرنا ہے' اسی کا دودھ پی لینا ہے' اسی کا گوشت کھا لینا ہے' اسی کی کھال سے خیمے اور کمبل تیار کرنے ہیں اور اسی کے اون سے کچھ چیزیں تیار کر لینی ہیں۔ ایسا بھی وقت آتا تھا کہ لق ودق صحرا میں اگر پانی دستیاب نہیں ہے تو اسی کا پیشاب پی لینا ہے۔ گویا ایک بدّو کی پوری زندگی اونٹ کے گرد گھومتی تھی۔ لہٰذا اپنے اونٹ کو کہیں باندھنے کے لئے ہمیشہ اس کے پاس رسّی کا ایک ٹکڑا رہتا تھا کہ جہاں وہ اونٹ سے اترا اس نے رسّی کے ایک سرے سے اونٹ کا ایک گھٹنا باندھ دیا۔ وہ رسّی "عِقال" کہلاتی تھی' یعنی گھٹنا باندھنے والی چیز — اب اسی رسّی کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا ہے تو اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ جب اونٹ کے گھٹنے سے رسّی کھولی تو اسے سر پر پڑے ہوئے رومال پر لپیٹ لیا۔ اس طرح یہ ان کی ایک علامت اور ان کا ایک دستور بن گیا اور شعائرِ قومی میں سے ان کے لباس کا ایک جزو بن گیا — جیسے آپ کو کوئی پٹھان مشکل ہی سے ایسا ملے گا جس کے کاندھے پر چادر نہ ہو — یہ چادر اس کے لباس کا جزو لازم بن گئی ہے۔ اسی طرح یہ عقال عربوں کے لباس کا ایک جزو لازم بن گیا ہے۔ یہ لفظ حدیث شریف میں بھی آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب مسجد نبویؐ میں آئے اور باہر اونٹ کو چھوڑ کر

آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اونٹ کو باندھا نہیں، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اللہ پر توکّل کیا۔ حضور ﷺ نے فوراً تعلیم فرمائی : ((اِعْقِلْهَا ثُمَّ تَوَكَّلْ)) "پہلے اونٹ کو باندھو، پھر اللہ پر توکّل کرو"۔ گویا اسلامی توکّل یہ نہیں ہے کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے۔ ہر کام کے لئے حتی الامکان اسباب جمع کرو، پھر اللہ پر توکّل کرو کہ اصل میں ان اسباب سے کچھ نہیں ہو گا، ہو گا وہی جو مسبّب الاسباب یعنی اللہ چاہے گا —— بہرحال عقل کے معنی کے بیان میں یہ جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آ گئے۔ میں جو کچھ عرض کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ جہاں تک جرأتِ عملی کا تعلق ہے وہاں عقل ساتھ نہیں دیتی، وہاں جذبات کام دیتے ہیں۔ عقل تو روکتی ہے، وہ تو یہ راہ سجھاتی ہے کہ اس وقت جان بچاؤ، تاکہ مستقبل قریب میں مناسب وقت پر کلمہ خیر کہہ سکو —— اِس وقت کوئی توریہ کر لو، کسی اور حیلے سے جان بچاؤ۔ تم ختم ہو گئے تو یہ دعوت ہی ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ کلمۂ توحید اور کلمۂ حق کہنے والا ہی کوئی نہیں رہے گا۔ تم یہاں سے جان بچا لو گے تو باہر جا کر کوئی شکل پیدا کر سکو گے۔ البتہ راہ کے تعین میں عقل مُمِد ہوتی ہے۔ یہ کام جذبات کے حوالے کیا گیا تو معاملہ غلط ہو جائے گا۔ چنانچہ ان میں توازن ضروری ہے۔ عقل سے روشنی حاصل کرو۔ جانا کدھر ہے، مقصد کا تعین اور رُخ کا صحیح تعین تو عقل ہی کرے گی۔ جذبات غلط رُخ پر ڈال دیں گے۔ لیکن جب راہ کا تعین ہو گیا کہ جانا کدھر ہے تو چلنے کے لئے اب عقل کو ایک طرف رکھنا ہو گا۔ اب جذبات ہوں گے جو آگے لے کر چلیں گے۔ پھر یہ جذبات ہی اس راہ کی مشکلات، موانع، تکالیف اور شدائد و مصائب سے نبرد آزما ہوں گے۔ عقل ان سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی۔ یہاں عشق اور جذبات کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہے۔ وہی ان تمام سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ پس عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبات کے تحت حرکت کرو۔ یہ توازن ازبس ضروری ہے اور یہی توازن ہے جو اکثر لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا۔

بہر حال ان لوگوں نے آگ کا ایک الاؤ تیار کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں جھونک دیا۔ سورۃ الانبیاء کے علاوہ اس واقعہ کا سورۃ الصافات کی آیات ۹۷' ۹۸ میں بھی ذکر موجود ہے۔ وہاں یہ حال ہے' بقولِ جگر مُراد آبادی ؎

نہ لا وسواس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی!

سورۃ الانبیاء میں ذکر ہے کہ ﴿ قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ۝ ﴾ "ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر" ﴿ وَ اَرَادُوۡا بِہٖ کَیۡدًا فَجَعَلۡنٰہُمُ الۡاَخۡسَرِیۡنَ ۝ ﴾ "اور وہ (نمرود اور اس کی قوم کے لوگ) ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کرنا چاہتے تھے' مگر ہم نے ان کو بُری طرح ناکام کر دیا" —— اور وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں گل و گلزار بن گئی۔ وہ اللہ کا بندہ اس امتحان میں بھی کامیاب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معجزانہ طریقے پر بچالیا۔

اس کے بعد یہ جان لیجئے کہ انبیاء و رُسل کے باب میں اللہ کی سُنّت اور اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی ملک یا معاشرے کے لوگ نبی کی جان لینے کے درپے ہو جائیں اور اس پر ہاتھ ڈال دیں تو گویا یہ معاشرہ اس طرح یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے اندر خیر کے قبول کرنے کا کوئی جوہر باقی نہیں ہے۔ گویا وہ اپنی محرومیت پر مُہرِ تصدیق ثبت کر چکا ہے۔ تو یہ وقت ہوتا ہے جب ہجرت کا مرحلہ آتا ہے اور نبی یا رسول کو حکم ہوتا ہے کہ اب یہاں سے ہجرت کرو اور کہیں اور چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا دارالنّدوہ میں فیصلہ ہو گیا تو مشرکینِ مکّہ کا یہ فیصلہ ہجرت کی تمہید بن گیا۔

ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت الی اللہ :

آگ کے الاؤ سے نکلنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کا فیصلہ کیا :

﴿ وَ قَالَ اِنِّیۡ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ۝ ﴾ (الصافات : ۹۹) "اور ابراہیم نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں' وہی میری رہنمائی کرے گا"۔ یعنی میں اپنے

رب کی خاطر گھربار اور وطن چھوڑ رہا ہوں۔ رہا یہ معاملہ کہ میرا آئندہ ٹھکانہ کہاں ہو گا تو اس کو میں اس کے حوالے کرتا ہوں' وہ میری رہنمائی کرے گا —— یہ ہوا پانچواں امتحان' وطن کو خیرباد کہنا اور صرف اللہ کے بھروسے پر وہاں سے نکل جانا۔ کوئی منزل پیش نظر نہیں' کوئی منصوبہ بندی نہیں۔ توکل کا یہ عالم کہ "میرا رب جلد ہی رہنمائی فرمائے گا" —— یہ آج سے چار یا ساڑھے چار ہزار سال قبل کی بات ہے۔ لہٰذا اس کو آج کے زمانے اور اپنے دور پر قیاس نہ کر لیجئے گا۔ اُس زمانے میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اُس وقت انسان کو جغرافیہ کا کتنا علم ہو گا اور اس کی کتنی معلومات ہوں گی کہ میرے ملک کے علاوہ کون کون سے قریبی ممالک ہیں اور ان کے باشندوں کی مذہبی و معاشرتی کیفیات کیا ہیں!! یہ نہیں تھا کہ یہاں بیٹھے آپ کے پاس امریکہ کے بڑے شہروں اور ہوٹلوں کے نام اور فون نمبر تک موجود ہیں اور آپ یہاں سے باقاعدہ پیشگی بکنگ کرا کے جا رہے ہیں۔ اس معنی میں اُس وقت انتہائی غیر یقینی صورت حال تھی۔ توکل و اعتماد تھا تو صرف اپنے رب پر ﴿قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ﴾ یعنی میں اپنے رب کی خاطر اسی کی طرف جا رہا ہوں' لہٰذا وہی میری رہنمائی کرے گا اور مجھے کوئی ٹھکانہ عطا فرمائے گا۔ یہ ہجرت خالص الی اللہ تھی۔ وہ جو حدیث آتی ہے کہ : ((فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ))[1] "پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہو گی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف شمار ہو گی"۔ اُس وقت بظاہر تو ہجرت ہو رہی تھی مدینہ کی طرف' لیکن اصل میں تو یہ ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف تھی —— وہاں منزل کا پتہ تو تھا' لیکن یہاں تو کچھ معلوم نہیں تھا کہ منزل کون سی ہو گی۔ لہٰذا میرے خیال میں حضرت ابراہیم

---

(۱) رواہ البخاری فی بدء الوحی' وفی الایمان' باب ماجاء ان الاعمال بالنیة.. ومسلم (ح ۱۹۰۷) فی الامارة' وابوداؤد (ح ۲۲۰۱) فی الطلاق' والترمذی (ح ۱۶۴۷) فی فضائل الجهاد' والنسائی (۱/ ۵۹' ۶۰)

(علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی یہ ہجرت' ہجرت الی اللہ کی کامل ترین نظیر ہے۔ اس ہجرت میں ان کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ یہ دونوں آپؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ حضرت لوطؑ کو بعد میں سدوم کی بستی کی طرف دعوتِ توحید اور رشد و ہدایت کے لئے مامور فرما کر بھیج دیا تھا —— اسی دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مصر کا سفر اختیار کیا' جہاں کے بادشاہ نے ایک شہزادی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا آپؑ کو ہدیہ میں دی۔ میں ان تفاصیل کو چھوڑ کر آگے چلتا ہوں۔

اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام کی ولادت :

اس ہجرت کی زندگی میں احساس ہوا کہ کچھ اعوان و انصار ہوں' کوئی دست و بازو ہو' تو زبان پر دعا آئی :

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۱۰۰)

''اے میرے رب! مجھے صالح اولاد عطا فرما''۔

دعا قبول ہوتی ہے اور اس بوڑھے موحد کو ستاسی سال کی عمر میں حضرت اسماعیل (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) جیسا بیٹا حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے عطا ہوتا ہے۔ آپ کی پہلی اہلیہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا' جو آپ ہی کے خاندان سے تھیں اور جنہوں نے ہجرت میں آپ کا ساتھ دیا تھا' بانجھ تھیں۔ ان کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جب فرشتوں کے ذریعے اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنا آپا پیٹ لیا تھا۔ اس کا ذکر سورۂ ہود میں آیا ہے :

﴿ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ﴾ (ھود : ۷۲)

''وہ کہنے لگی : ہائے میری بدبختی' میں بوڑھی پھونس اور بانجھ' کیا اس عمر میں میرے یہاں اولاد ہو گی؟ جبکہ میرے شوہر بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ تو بڑی انوکھی بات ہے۔''

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کا اللہ کی قدرت پر ایمان نہیں تھا یا وہ واقعی اولاد کی خوشخبری کو بدبختی سمجھتی تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اَن ہونی خبر پر برینائے طبع بشری ایک عورت کے جو جذبات و احساسات ہو سکتے ہیں، وہ بے اختیار ان کی زبان پر آ گئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد کی پوری زندگی مسلسل مسافرت و مہاجرت کی داستان ہے۔ آج شام میں ہیں تو کل مصر میں، پرسوں اردن یا فلسطین میں، پھر حجاز کا بھی دورہ ہو رہا ہے۔ فکر ہے تو یہی کہ کلمۂ توحید سربلند ہو اور اس دعوت کے جابجا مراکز قائم ہو جائیں —— جب کہولت کے آثار کچھ زیادہ طاری ہوتے محسوس ہوئے تو یہ دعا زبان پر آئی کہ ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ ﴾ اس کا جواب ملتا ہے : ﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ ﴾ (الصافات : ۱۰۱) "پس ہم نے اسے ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔" اللہ کی قدرت اور دین ہے، جس کو جو چاہے دے دے۔ چنانچہ اس بڑھاپے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک بردبار اور حلیم بیٹے اسمٰعیلؑ کی پیدائش کی خوشخبری دی جاتی ہے اور بعد میں حضرت اسحٰق کی ولادت کی، تو یہ بندۂ حنیف اللہ کے اس فضل و کرم پر بایں الفاظ شکر ادا کرتا ہے کہ :

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ﴾

"(ابراہیم علیہ السلام نے کہا) اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق جیسے وارث عطا فرمائے۔"

جوانی کا دور ہوتا اور بیٹے ہو گئے ہوتے تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ عام عادی قانون یہی ہے۔ اس کا بھی شکر ایک مسلمان پر واجب ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہے "عَلَى الْكِبَرِ" کا۔ دعا کی اس مقبولیت پر دل کی گہرائیوں سے ترانۂ شکر ادا ہوا۔ اسی لئے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ :

﴿ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○ ﴾ (ابراھیم : ۳۹)

"بلاشبہ میر[illegible] دعا ضرور سنتا ہے۔"

امتحان و آزمائش کا نقطہ عروج :

اب سورۃ الصافات میں (از آیت ۱۰۰ تا آیت ۱۱۱) چھٹے اور آخری امتحان کا ذکر شروع ہوتا ہے اور نہایت مختصر، لیکن جامع ترین الفاظ میں صورت حال کی ایک ایسی مکمل تصویر کھینچ دی جاتی ہے کہ ہم چشمِ تصور سے پورے واقعے کو ہر دور اور ہر زمانے میں دیکھ سکتے ہیں۔

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾ (الصّٰفّٰت : ۱۰۰۔۱۱۱)

"(ابراہیم علیہ السلام نے کہا) اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔ (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا : بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا : ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا۔ اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم تُو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیئے میں دے کر اس (بچے) کو چھڑا لیا اور اس (قربانی) کو (بطور یادگار ہمیشہ کے لئے) بعد کی نسلوں میں چھوڑ دیا۔ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم

نیکو کاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔"

بڑھاپے میں دعائیں کر کر کے تو اللہ سے بیٹا لیا اور وہ بھی کیسا بیٹا! حلیم' نہایت بردبار' سلیم الطبع' فرماں بردار' صابر اور سعادت مند —— لیکن اب آخری امتحان کے لئے اسٹیج سیٹ ہو رہا ہے۔ گویا قدرت مسکرا رہی ہے کہ ایک سو سالہ بوڑھے انسان کا امتحان' بڑا کڑا امتحان ابھی باقی ہے۔ یہ بڑے بڑے امتحانوں سے گزر کر آیا ہے' لیکن ابھی آخری تیر ایک بھاری اور مشکل امتحان کی صورت میں ہمارے ترکش میں موجود ہے —— امتحان کی گھڑی دیکھئے ﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ﴾ "تو جب وہ (بیٹا) اس (باپ) کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل ہوا" تو اس امتحان کا وقت بھی آ پہنچا۔ بچہ اگر بالکل شیر خوارگی کی عمر میں ہوتا' بالکل چھوٹا سا ہوتا تو قدرے ہلکا امتحان ہوتا۔ لیکن اب تو کڑی سے کڑی آزمائش مطلوب ہے۔ ادھر بوڑھا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو جوان ہوتے دیکھ رہا ہے' اِدھر محبت و جذبات اور امیدوں اور تمناؤں کے امتحان کا مرحلہ آ گیا —— اور اس کے لئے وقت منتخب کیا گیا جب زندگی کی بھاگ دوڑ میں وہ بوڑھے باپ کے ہاتھ کی لاٹھی بننے کے قابل ہو گیا' جدّوجُہد اور محنت و مشقت میں ہاتھ بٹانے والا بن گیا۔ جس کو ہم کہیں گے کہ فی الحقیقت دست و بازو بن گیا —— اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی —— تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے کہتے ہیں : ﴿ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴾ "اے میرے پیارے بچے! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ (روایات میں آتا ہے کہ مسلسل تین رات یہ خواب آیا ہے) اب تم دیکھو' غور کرو اور بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے!" بیٹے کی رائے معلوم کر کے باپ بھی بیٹے کا امتحان لے رہا ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ سچا خواب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کی آخری' حتمی اور قطعی صورت "وحیٔ نبوّت" ہے۔

وحیٔ نبوّت کا دروازہ نبی اکرم ﷺ پر تاقیامِ قیامت بند ہو گیا' لیکن اس سے کچھ کم تر چیزیں اب بھی باقی ہیں۔ الہام اب بھی ہے' کشف اب بھی ہے' القاء اب بھی ہے۔ اللہ اپنے جس بندے کے دل میں جو بات چاہے ڈال دے' اس کے لئے نبوت شرط نہیں ہے۔ نبوت خواتین کے لئے تو ہے ہی نہیں لیکن اللہ نے اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کے دل میں بات ڈالی اور کتنے یقین کے ساتھ ڈالی کہ اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں صندوق میں بند کر کے دریا کے حوالے کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر یہ یقین نہ ہوتا کہ بات مجھ پر القا ہوئی ہے' اگر ذرا بھی گمان ہوتا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے' تو وہ یہ اقدام ہرگز نہیں کر سکتی تھیں! پس الہام' القاء' کشف اور رؤیائے صادقہ' یہ ساری چیزیں اب بھی ہیں۔ یہ چیزیں نبیوں کے لئے بھی تھیں اور غیر نبیوں کے لئے بھی — خود نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ وحیٔ نبوت کا دروازہ مجھ پر بند ہو گیا' لیکن رؤیائے صادقہ کا سلسلہ جاری رہے گا جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ ایک روایت میں سواں حصہ بھی آیا ہے۔ البتہ نبیوں کے لئے یہ چیزیں' یعنی الہام' القاء' کشف اور رؤیا (خواب) بھی وحی کے درجے میں ہوتے ہیں اور ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ فوراً یقین کر لیتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

اب بیٹے کی حلیمی کا اظہار ہو رہا ہے : ﴿قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ○﴾ "اس (بیٹے نے) کہا' ابا جان! کر گزریئے جو حکم آپ کو مل رہا ہے' آپ ان شاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے"۔

﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا...﴾ "تو جب وہ دونوں مسلمان ہو گئے..." یہاں میں نے جان بوجھ کر "مسلمان ہو گئے" ترجمہ کیا ہے۔ اسلام' جس کو ہم نے بدنام کیا ہوا ہے' اسکے اصل معنی ہیں گردن نہادن' سرِ تسلیم خم کر دینا۔ جو بھی اللہ کا حکم ہے اسکی بلا چون و چرا اطاعت اور فرماں برداری کرنا "اسلام" ہے۔ بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

یہ ہے اسلام۔ ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ ﴾ پھر جب دونوں نے اسلام کا مظاہرہ کیا' دونوں نے گردن جھکا دی' جب دونوں نے اللہ کے حکم کو بسرو چشم قبول کر لیا۔ اور اس (ابراہیمؑ) نے اس (اسماعیلؑ) کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا' تاکہ چہرہ سامنے نہ رہے اور جذباتِ فطری عین وقت پر جوش میں نہ آ جائیں' بوڑھے ہاتھوں میں کہیں لرزش پیدا نہ ہو جائے۔ سو برس کا بوڑھا ہے جو اپنے تیرہ برس کے اکلوتے بیٹے کے گلے پر چھری پھیرنے کی تیاری کر رہا ہے —— ﴿ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ ﴾ "اور ہم نے اس کو پکارا اے ابراہیم!" (بس کر) ﴿ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ﴾ "بلاشبہ تو نے خواب کو سچ کر دکھایا" اس سے زائد ہمیں بھی درکار نہیں۔ یعنی ممتحن کو بس کرنا پڑی' جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اس نے بس نہیں کی۔ چشمِ فلک اس نظارے کی تاب نہ لا سکی کہ ابراہیمؑ بیٹے کو بالفعل ذبح کر رہا ہے۔ امتحان پورا ہو گیا' تم آمادہ ہو گئے اور اپنی محبوب ترین شے کو اللہ کی محبّت و اطاعت کی خاطر اور اس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے جی جان سے تیار ہو گئے' لہٰذا امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ تمہاری کامیابی تسلیم۔ ﴿ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ "ہم اسی طرح ان لوگوں کو جو محسن ہوتے ہیں' جو درجہ احسان پر فائز ہو جاتے ہیں' اپنے انعامات اور جزا سے نوازتے ہیں" —— محسن' احسان کرنے والے نہیں۔ ایک احسان دوسروں پر ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ مفہوم اردو میں مستعمل ہے۔ عربی میں احسان کا یہ مفہوم بھی ہے' لیکن اس کا اصل اور حقیقی مطلب و معنی کسی کام کو نہایت خوبصورتی سے کرنا ہے۔ اسلام میں جب کمال پیدا ہو جائے تو وہ احسان ہو جائے گا۔ حدیثِ جبرائیل میں یہ تین مراتب بیان ہوئے ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام' ایمان اور احسان تینوں کے بارے میں سوال کیا : اَخْبِرْنِىْ عَنِ الْاِسْلَامِ' اَخْبِرْنِىْ عَنِ

الْاِیْمَانِ اور اَخبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ —— یہ بتایئے اسلام کسے کہتے ہیں؟ یہ بتایئے ایمان کسے کہتے ہیں؟ یہ بتایئے کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ تو احسان ہمارے دین میں بہترین اعمال کی ارفع و اعلیٰ یعنی بلند ترین سطح کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ○﴾ "اسی طرح ہم نیکو کاروں اور خوب کاروں کو جزا دیتے ہیں"۔ آگے فرمایا: ﴿اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ○﴾ "واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑا کھلا امتحان تھا' بہت کڑی آزمائش تھی" —— اب آپ خود ہی سوچئے کہ اس سے بڑا کامیابی کا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان واقعی بہت کڑا' بہت مشکل اور بہت کٹھن تھا۔ اب معاملہ رہ کیا گیا تھا؟ چھری تو پھیر ہی دی تھی۔ لیکن اس چھری نے حکم الٰہی سے کام کیا نہیں۔

ذبح عظیم

اب آگے بڑھنے سے قبل اس ابتلاء' آزمائش اور امتحانات پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال لیجئے جن سے گزرتا ہوا یہ سو سال کا بوڑھا اس آخری اور کڑے امتحان تک پہنچا ہے۔ والدین اور گھربار کو اس نے چھوڑا اللہ کے لئے' قوم سے اس نے منہ موڑا اللہ کی توحید کے لئے' شہنشاہ اور اقتدارِ وقت سے وہ جا ٹکرایا اللہ کی توحید کے لئے' اپنی جان دینے پر وہ آمادہ ہو گیا اللہ کی توحید کے لئے' وطن کو اس نے خیرباد کہا اللہ کی توحید کیلئے —— اپنے اکلوتے تیرہ سالہ نوعمر بیٹے کو وہ ذبح کرنے کیلئے تیار ہو گیا حکم الٰہی کی تعمیل میں —— یہ آخری امتحان تھا' سب سے کڑا' سب سے مشکل —— اس کے نتیجے میں ہوا یہ کہ: ﴿وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ○﴾ "اور ہم نے اس (اسماعیل) کو چھڑایا ایک عظیم قربانی دے کر" —— یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ان کے بدلے میں ایک بڑی قربانی دے کر خود اللہ تعالیٰ نے ان کو چھڑایا۔

یہ ذبح عظیم کیا تھا؟ اس کے متعلق روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کا ایک مینڈھا تھا۔ قرآن مجید میں جس بات کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہو تو اس کی تفصیل کیلئے